© rasailojaraid.com

ان کی رُوح صرف خلوص تھا۔ اور جو کچھ ہوا وہ کم نہیں تھا۔

یہ دَورہ وفد نے اپنے پروگرام کے تحت خود کیا تھا، جس کی منزلِ اوّل پاکستان تھا۔ اس کے بعد انہیں دنیا کے مختلف حصّوں میں جانا ہے اور ہر جگہ دین کا پیغام پہنچانا ہے، ہر جگہ مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینا ہے، اور ہر جگہ اسلامی تنظیموں سے خصوصی رابطہ پیدا کرنا ہے۔ سعودی عرب کی یہ خدمت بہت قابلِ قدر ہے کہ اس کے عمائد اور علماء اور اس کے بعض ادارے دنیا بھر میں دعوتِ اسلامی اور تحریکِ اسلامی کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ خود پہنچ پہنچ کر کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں، عالمِ اسلامی میں جذبۂ اتحاد کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب جبکہ یہ مبارک وفد پاکستان سے بھارت جا چکا ہے تاکہ وہاں کے مسلمانوں کے احوال کو دیکھے سمجھے، اور پھر آگے دوسرے ملکوں میں جائے گا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس وفد کو اپنے مبارک مقاصد میں کامیاب کرے اور سفر کو آسان بنائے۔

---

(۲)

اقبال کے سالِ پیدائش سے ٹھیک ایک صدی بعد "سالِ اقبال" منایا گیا۔

پہلے تو نہیں، مگر اس سال یہ سوال بڑی اہمیت سے میرے ذہن میں اُبھرا کہ اقبال کو جو وسیع محبوبیت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کا راز کیا ہے۔ اپنے ملک یا اپنی قوم میں کسی کا چرچا ہو جانا بھی بڑی بات ہے، مگر یہاں تو صورتِ معاملہ یہ ہے کہ شروع ہی سے اقبال پر دانشورانِ مغرب نے توجہ دی اور یہ توجہ اب تک مسلسل بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ پھر مسلم ممالک اور اشتراکی ممالک سبھی میں اقبال کے فکر و فن پر کام ہو رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ اقبال کے بعض دَورِ حیات میں اس کے اعلیٰ اور وسیع روابط کی بنا پر کچھ حلقوں میں دلچسپی رہتی اور پھر وہ آہستہ آہستہ غائب یا کم ہو جاتی۔ پھر اقبال نے نہ تو بطورِ خود اس کی تحریک کی کہ کچھ لوگ اس کے نام اور کام اور پیغام کو اچھالنے والے ہوں اور نہ اقبال

---

[1] علامہ مرحوم کی تاریخِ پیدائش سے متعلق جو بحثیں میری نظر سے گذری ہیں۔ ان کی بنا پر مجھے اطمینان نہیں ہے کہ علامہ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اس بات کو "غلط العام" بلکہ حقیقت میں غلط "عوامی" کی حیثیت سے سب کے ساتھ مجھے "برداشت" کرنا پڑا ہے۔ (ن۔ص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی زندگی میں سرکاری سطح پر اور نہ پاکستان بننے کے بعد اعلیٰ قومی سطح پر کوئی ایسا موثر اہتمام ہوا کہ اس شخصیت کا بھرپور گوشے گوشے میں اُڑایا جائے۔ کوئی پروپیگنڈہ مشینری بھی نہ تھی کہ مغربی اور مسلم ممالک کے جرائد میں کچھ لوگ اقبال کو موضوع بنا کر اشاعتی مہم جاری رکھتے۔ قوم نے اقبال کو اس رسمی انداز میں بھی نہیں لیا جسے ہیروشپ یا اکابر پرستی کہتے ہیں۔ اس طرح کسی مصنوعی تدبیر کے بغیر ایک شخص کو دنیا بھر سے محبت و احترام کا خراج ملتا ہے۔

شعرا پہلے بھی اچھے سے اچھے ہو گزرے اور اب بھی موجود ہیں، جن سے دنیا بھر میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ عظیم درجے کے فلسفی بھی ہو گزرے ہیں اور آج بھی یکے بعد دیگرے نمودار ہو رہے ہیں، پیغام رکھنے والے مصلحین بھی ہر قوم میں اُبھرے، اور اب بھی سامنے آتے ہیں۔ مگر کسی شاعر، کسی فلسفی اور کسی مصلح کو یہ مقام نہ ملا کہ جگہ جگہ نہ صرف اسے پڑھا سمجھا جا رہا ہو، بلکہ اُس کے لیے ایک والہانہ جذبۂ محبت و احترام بھی موجود ہو۔

اس حیرت انگیز اور پراسرار حقیقت کو سمجھنے کے لیے میں نے جو تجزیہ کیا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ علامہ مرحوم کا ایک گراں بہا کارنامہ یہ ہے کہ مغربی لٹریچر اور مغربی فلسفہ اور مغرب کے پولیٹیکل اور سوشل ڈھانچے کا بھرپور عمیق مطالعہ خود مغرب کی سحر آگیں فضا میں رہ کر کرنے کے بعد وہ تہذیب نَو کے سرابوں میں ڈوبا نہیں رہ گیا جن میں غوطہ لگانے والے اہل سیاست، اہل قانون اور اہل ادب و صحافت دوبارہ اُبھر نہ سکے، بلکہ اقبال پہلا ممتاز مفکر ہے جو ان سرابوں کی طلسماتی موجوں کے داموں کو توڑ کر نہ صرف زندہ و سلامت نکل آیا بلکہ اس کی سوئی ہوئی مسلمانیت بیدار ہو گئی۔ اور وہ دنیا کے سامنے تہذیب مغرب کے خلاف اپنا چارج شیٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔

اقبال نے دَورِ حاضر سے فائدہ بھی اُٹھایا، ابتدا میں قدرے مرعوب بھی ہوا، مگر اس کا اصل کردار یہی ہے کہ اُس نے دَورِ حاضر کے تہذیبی فساد کو نمایاں کیا، اس کے کمزور پہلوؤں پر شدید گرفت کی اور اس کے تضادات کو عالم آشکارا کیا۔

اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ اُس نے مادیت کی چکی میں پستے ہوئے انسان کی مظلومی کو سمجھا اور اس سے دل کی گہرائیوں سے ہمدردی کی۔ اُس نے نسل و وطن کی تفریقوں اور طبقاتی تقسیموں کو بے نقاب کیا اور بادشاہت، آمریت اور جمہوریت کی اذیت ناکیوں کا نوحہ گایا۔ اُس نے دولت، عورت، محنت، جنگ اور صلح کے مسائل چھیڑے۔ اس نے انسان کی اخلاقی اور روحانی ضرورتوں کے راگ الاپے۔

۲۔ علامہ نے فلسفہ پڑھا اور اس میں محض ایک امتحان پاس کرنے والے طالب علم کی سی دلچسپی نہ لی بلکہ ذاتی دلچسپی کے تحت نصابیات کے دائرے سے باہر نکل کر انسانی فکر و قیاس کے سمندر کو کھنگالا۔ اور جب وہ اس سمندر سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باہر نکلا تو خود ایک سمندر تھا۔ مغربی فلسفے کے لیے اس کے اندر اگر کوئی مرعوبیت تھی بھی تو چند ہی غواصیوں کے بعد ختم ہو گئی۔ اور وہ اس فلسفے کے خلاف ہمہ تن ایک صدائے احتجاج بن گیا۔ مگر یوں نہیں کہ مغربی فلسفے سے محض بیزاری یا اختلاف کا اظہار کر دیا ہو، بلکہ از سرِ نو ایک فلسفے کی بنیاد رکھی اور مروجہ فلسفے کے اکابر و اساطین کے حوالوں سے بات اٹھائی۔ سائنس کی جدید ترین دریافتوں کو سامنے رکھا اور اپنے ایمان کی روشنی میں فکر و قیاس کی وہ نئی راہیں کھولیں جن پر چل کر خدا، وحی، نبوت، رسالت، ختم نبوت، حشر و نشر جیسے حقائقِ غیبیہ اس طرح سامنے آتے ہیں کہ عقل سرِ انقیاد جھکا دیتی ہے۔ سائنس، فلسفے اور ایمان کا جو امتزاج تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر چند کہ یہ کتاب اقبال کے دورِ ما بعد یا دورِ تکمیل کی آئینہ دار نہیں ہے اور اس میں پیش کردہ بہت سے افکار سے خود اقبال نے اختلاف کیا ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے میدان میں اپنے طرز کی واحد کتاب ہے، اور شاید اب تک جدید مسلم فلسفیوں میں سے کسی نے قدم آگے نہیں بڑھایا۔ ہمارے یہاں تاثر یہ تھا کہ فلسفہ پڑھنے والے لوگ ملحد ہو جاتے ہیں۔ یہ قدرے صحیح بھی تھا، کیونکہ جدید فلسفہ تمام تر ملحدانہ مادیت کے مرکزی نقطے کے گرد مرتب ہوا تھا۔ اقبال نے ملحدانہ فلسفے کے متوازی خدا پرستانہ فلسفے کی راہ نکالی۔ اقبال کا یہ کام متکلمین اسلام سے بھی مختلف ہے۔ کیونکہ وہ فلسفہ نو تشکیل نہیں کرتے تھے۔ اور عیسائی فلسفیوں سے بھی مختلف ہے۔ کیونکہ وہ فلسفے کے نام سے بالعموم متکلمینِ عیسائیت کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ان کے سامنے مذہبی مواد بڑا محدود تھا اور پرواز کے لیے فضا تنگ تھی۔

اس کتاب[۱] میں اقبال کی اہم ترین بحث زمان (اور مکان) کی بحث ہے۔ وہ اپنا فلسفہ زمان مرتب کرنے کے لیے عرصہ دراز تک پڑھتے رہے۔ قدیم علما کی کتابوں میں مواد تلاش کرتے رہے، معاصر اہل علم سے مشورہ کرتے رہے۔ پھر جب پوری تیاری کے ساتھ مسئلہ چھیڑا تو اس شان سے کہ زمان کی تلوار سے مادیت کی جڑ کاٹ دی۔ یہ کتاب سیکولرازم کے خلاف گویا ایک اعلانِ جنگ ہے۔

اقبال کے اس کام نے اہل مغرب کو حیران کر دیا۔ یوں بھی ہمارے معاشرے کے گنبد افکار سے اہل مغرب کو

---

[۱] دوسری طرف اقبال کا متوازی کام بہ عنوان مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی، اسلام کے اساسیات کو ترتیب اور جامعیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے اندازِ بیان سے بھی فلسفہ جھلکتا ہے۔ یہ مثنوی بھی اہل مغرب کی توجہات کو کھینچنے میں کامیاب ہوئی۔ اس سے انھیں اسلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع ملا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی ہی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی اور نظام کا تمام جدید تعلیم یافتہ طبقہ سازِ محکومی سے تقلید کے راگ چھیڑ رہا تھا۔ ایسے میں اقبال کا آزادانہ نغمۂ تنقید و تنبیہ اُن کے لیے جاذبِ توجہ ہوا۔ نقالوں اور خوشامدیوں اور مقلدوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے نواب کبھی کبھی آزاد مردوں کی آواز کو ترس جاتے ہیں۔ قدر ہمیشہ زندہ ضمیر اور بیدار دل لوگوں کی ہوتی ہے۔

۳۔ نوعِ انسانی کے دردناک مسائل ـــ جنگ و تصادم، بھوک، مزدوروں سے بے انصافی، قوموں کی غلامی۔ استعماری قوتوں کی لوٹ کھسوٹ، بیماریوں کا فروغ، جہالت کی عمومیت، نسل و وطن کی کھینچا تانیاں، اور خاندان کی تباہی، عورتوں کا ناجائز استعمال، جدید معاشرت کی گندگیاں۔ ان سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقبال نے مسلسل سوچا کر راہ نجات کیا ہے۔ پھر بغیر کسی اندھے تعصب کے تمام جدید نظریوں اور نظاموں کی جانچ پرکھ کے بعد اسلام پہ انگلی رکھ دی کہ صرف یہی ایک نظام فلاحِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

پھر بغیر کسی خوف کے اپنی مؤثر و دلنشیں شاعری میں اسلامی عقاید، احکام، عبادات، اخلاقیات اور سیاسی، معاشی اور تمدنی مسائل کو سمو دیا۔ شاعری کے لیے مقصد کو لازمی قرار دیا، مگر مقصد کو شاعری کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا کہ کہیں لذتِ سخن مجروح نہ ہونے پائی بلکہ ایک نئے طرز کا شکوہِ سخن پیدا ہو گیا۔ بات کہنے کے ایسے ایسے اسلوب ایجاد کیے کہ غور کرنے پہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً وہ کسی واعظ یا فقیہ کی طرح نماز پڑھنے کا وعظ نہیں کہتے بلکہ صرف اتنے پہ اکتفا کرتے ہیں کہ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ۔۔۔ ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ان مختصر الفاظ میں بڑا وسیع استدلال موجود ہے۔ یہ بات شعر کے پس منظر میں ہے کہ ذوقِ پرستش تو آدمی کی فطرت میں شامل ہے۔ اس ذوق کی تسکین اگر خدائے واحد کی عبادت سے نہ کی جائے تو پھر یہاں سیکڑوں خدا خراجِ عبادت لینے کے لیے نکل آئیں گے۔ توحید ان سب سے نجات پانے کا ذریعہ ہے۔

میں نے جا بجا بغور دیکھا ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں، نیز تراکیب اور تشبیہوں کے استعمال میں جو کمال اقبال کے ہاں ہے وہ کہیں نہیں ملتا۔ شعرِ اقبال میں عجب ساحرانہ اثر ہے۔ اقبال نے ادب برائے ادب یا فن برائے فن کا پورا قلعہ مسمار کر کے اپنا جھنڈا گاڑا ہے۔

پھر اس شخص کے پڑھنے کا انداز بھی وہ تھا کہ شاہی مسجد میں جس دن شہیدانِ طرابلس سے متعلق مسلمانوں کے اجتماع میں اپنی نظم سنائی، اس دن آخری شعر (مصرعہ: طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں) (باقی بر صفحہ ۴۱)

© rasailojaraid.com